

ایک سفر نامہ جو کہیں کا بھی نہیں ہے

ہم نے سفر نامے بہت لکھے ہیں۔ چین و ماچین کے سفر نامے، ایران و توران^۱ کے سفر نامے، ان جگہوں کے سفر نامے جہاں، ہم نہیں گئے اور ان وارداتوں کا چشم دید احوال جو ہم نے نہیں دیکھیں۔ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ٹانگیں بے شک دی ہیں لیکن دماغ بھی تو دیا ہے جس کی اہمیت ٹانگوں کے برابر نہ ہو، بہر حال ہے تو۔

آج کا سفر نامہ ہے تو سفر نامہ لیکن اگر کوئی پوچھے کہ کہاں کا ہے تو بتا بھی نہ سکیں۔ آج صبح ہم کابل کے لیے چلے تھے، لیکن رات ہو گئی ہے اور کابل پہنچے نہیں ہیں۔ پہلے راو پلنڈی میں لیٹ ہوئے، پھر پشاور سے چلنے میں تعویق ہوئی۔ آخر چلے۔ پائلٹ نے بتایا کہ آپ کے نیچے اس وقت درہ خیبر ہے۔ پھر کہا، یہ داہنی طرف کو جلال آباد کا قصبہ ہے اور میڑھی میڑھی جوئے کم آب دریائے کابل کہلاتا ہے۔ اب آپ حکومت افغانستان کے وہ فارم بھر دیجیے جن میں وطنیت قومیت وغیرہ لکھنی ہوتی ہے اور اب صاحبان! (پائلٹ نے کھنکار کر کہا) اب تھوڑی دیر میں ہم پشاور کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں کیونکہ کابل گھنگور بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہاں ہم اتر نہیں سکتے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔

دراصل آثار شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھے۔ جب سے کابل جانے کا سنا لوگ ہمیں برابر ڈرارہے تھے کہ سردی ہے جانا نہیں، مر جاؤ گے۔ مولانا حامد علی خاں نے کہا، میں کابل میں دو دو اور کوٹ پہن کر بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ تن زیب کا انگر کھا پہنے ہوئے ہوں۔ حمید اختر نے نصیحت کی کہ جاتے ہی وہاں سے ڈگلا نما افغانی کوٹ خرید لینا (ورنہ میں نتائج کا ذمہ دار نہ ہوں گا) ان لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر طعنے تشنے پر اتر آئے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے جو تم وہاں جا رہے ہو۔ خیر، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

ایک جو ناما رکیٹ ہم شرمائشی میں نہیں گئے، ورنہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ہم نے اپنے لیے کپڑے جمع نہیں کیے۔ ہمیں دراصل اوردو کوٹ وغیرہ درکار تھے اور کوئی اونی زیر جامہ مل جاتا تو سبحان اللہ لیکن ہماری شہرت ایسی خراب ہوئی کہ لوگوں نے قیاس کیا، ہم شاید فلسطین کے مہاجرین یا افغانستان کے پادندوں کے لیے کپڑے جمع کر رہے ہیں۔ بیچنے سب نے اپنے پھٹے ہوئے، گھسے ہوئے کپڑے ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر واپس دے گا تو

۱۔ وسط ایشیا کا وہ علاقہ جو لریہ دون کے چلے "تور" سے منسوب ہونے کی وجہ سے توران کہلاتا تھا۔

۲۔ ہر شخص کا خیال اس کے طرف اور حوصلے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

ڈرائی کلین کرا کے دے گا۔ نہ دے گا تو ہماری جان ان کپڑوں سے چھوٹے گی۔ دونوں صورتوں میں نقصان اسی شخص کا ہے۔ اور کوٹ ہمارے پاس دو ہو گئے۔ ایک تو آغا جعفری کا عطیہ اتنا خوب صورت اور دیدہ زیب کہ پہننے کو جی نہ چاہے۔ دوسرا حبیب اللہ شہاب کا جو شاید انھوں نے قطب شمالی کی مہم کے لیے بنوایا تھا کیونکہ ہم نے اسے پہنا تو بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ گئے۔ دو آدمیوں نے ہماری بانہوں میں ہاتھ دے کر ہمیں دوبارہ کھڑا کیا اور پھر اسے پہن کر ہم بالکل برفانی ریچھ معلوم ہوتے تھے۔ بس رنگ کا فرق تھا کیونکہ برفانی ریچھ غالباً سفید ہوتا ہے۔ گلہ و دستار ہم سر پہ نہیں رکھتے لیکن اس خاص موقع کے لیے ایک فیلٹ خریدی، اس کا الٹا سفید معلوم کیا۔ لومڑی کی کھال کے دستانے لیے، گلے میں کاغذی ڈالنے کا بھی خیال تھا لیکن وہ کشمیر کی خاص چیز ہے، ہمارے کراچی میں نہیں ملتی۔

اس سارے ساز و سامان سے لیس ہو کر دم تحریر ہم پشاور میں پڑے ہیں۔ یہ ڈین ہوٹل کا کمرہ ۴۷ ہے۔ آٹھ دان میں آگ دہک رہی ہے۔ جس طرح ہمارے گاؤں کے فتح دین درزی نے کراچی میں ایف۔ ڈین اینڈ سنز ٹیلرز اینڈ آؤٹ فٹرز کے نام سے اپنی دکان لگائی اور چمکائی ہے۔ اس سے ہم سمجھتے تھے کہ ڈین ہوٹل بھی کسی احمد دین نور دین کا ہوگا لیکن ہوٹل کا ناک نقشہ بتاتا ہے کہ یہ واقعی کسی انگریز بہادر کی ملکیت رہا ہے۔ لان کشادہ، احاطہ کشادہ، کمرے کشادہ، ہر چیز کشادہ ہے سوائے مالکوں کے دل کے، کیونکہ ہمارے کمرے میں بجائے غالیچوں کے ان کی کتر نہیں پڑی ہیں۔ ٹھنڈے کمرے کے فرش پر ان پر پاؤں رکھتے ہوئے یوں گزرنا پڑتا ہے جیسے کچھڑ میں پڑی ہوئی اینٹوں پر بیچتے بچاتے قدم رکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ لاؤنج کے قالین بھی گھسے پھسے ہیں اور عظمت رفتہ کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ جدید ہوٹلوں کی سی نہ اس میں شان ہے نہ آسائش۔ اپنی عمر طبعی میں سے یہ کچھ ہنس کر گزار چکا ہے اور کچھ رو کر گزار رہا ہے۔ سید محمد جعفری نے جو مصرع پرانے کوٹ کی مدح میں لکھا تھا، ہمیں اس ہوٹل کو دیکھ کر یاد آیا:

ع کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

باوجود فون کرنے کے کوئی دوست پشاور میں نہ مل سکا لیکن پشاور والوں کی عالی حوصلگی سے ہم کماٹھ، متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمیں پی آئی اے کے دفتر جانا تھا۔ کسی نے بتایا کہ انٹرنیشنل ہوٹل میں ہے۔ ہم نے اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر پوچھا کہ کتنی دور ہے یہ جگہ؟ تو کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ جناب بالکل ہمارے پچھواڑے ہے، بس کوئی ایک فرلانگ ہوگی۔ آپ ہوٹل کے دروازے سے نکل کر بڑی سڑک پر آئیے اور بائیں ہاتھ کو چلیے بس سامنے ہی ہے۔

جب ہم اس ہدایت کے مطابق کوئی پون میل کی مسافت طے کر چکے تو ایک صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے کہا، پی آئی اے کا دفتر! جی وہ تو یہ رہا۔ آپ کو اسی راستے پر ایک سینما ملے گا، اس کے بعد بس پی آئی اے کا دفتر ہے اور واقعی اس جگہ سے کوئی آدھ میل آگے ہمیں وہ دفتر مل گیا۔ یہ جگہ واقعی ڈین ہوٹل کے پچھواڑے میں ہے لیکن ایسا ہی ہے جیسے کراچی

کے پچھواڑے میں کاٹھیا واڑ ہے اور لاہور کے پچھواڑے میں تبت پڑتا ہے۔ انسان عالی حوصلہ ہو تو اسے میل اور فرسنگ کے فاصلے فرلائیں اور گز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا پشاور کی مزید سیر کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اس ایک مثال سے خائف ہو گئے کیونکہ ہم ان بزرگ سے پوچھتے کہ درزہ خیبر کتنی دور ہے تو وہ یقیناً یہی فرماتے کہ بس دو منٹ کا راستہ ہے سیدھے اس سڑک پر چلے جائیے۔ اگلے چوک پر داہنے ہاتھ کو درزہ خیبر ہی تو ہے۔

پشاور کے ہوائی اڈے پر ہم نے اپنے ہم سفروں میں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ کو دیکھا کہ لمبی سرخ داڑھی ہے اور سر پر بھی گنگھی سے بے نیاز بالوں کا جھاڑ کھڑا ہے۔ تھوڑا لنگڑا تے ہیں اور چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ پھول دار واسکٹ پہنے ہوئے تھے یعنی ان کی وضع قطع، سب دھج سب سے الگ تھی۔ ہم پی آئی اے کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ دکھا رہے تھے کہ وہ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور فرمایا۔ تمہارے پاس یہ SAS یعنی سکندے نیوین ایئر سروس کا ٹکٹ کہاں سے آ گیا؟ ہم نے بتایا کہ یونیسکو جس کی طرف سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، اس نے پیرس سے اس کا انتظام کیا تھا۔ بولے مجھے یوں جستجو ہوئی کہ میں ڈنمارک کا ہوں اور SAS میرے وطن کی کمپنی ہے۔ اس پر بات چل نکلی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ آپ کے وطن کی زیارت بھی ہم کر چکے ہیں۔ کوپن ہیگن کے علاوہ اسی نورٹ بھی گئے تھے۔ جہاں ہملٹ کے قلعہ ہے اور جہاں سے سمندر پار سویڈن نظر آتا ہے۔

بولے، مجھے افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر ڈنمارک میں گزار کر اسی نور آج تک نہیں دیکھا۔ ہم نے یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ ہم نے بھی کراچی میں آدھی عمر گزار دی ہے لیکن منگھو پیر نہیں گئے۔ زیادہ تفصیل میں ہم نہیں گئے تاکہ ہمارا منگھو پیر ان کے اسی نور کے مقابلے میں کچا نہ پڑ جائے۔ یہ ڈاکٹر گلبرگ تھے۔

ڈاکٹر گلبرگ دو اداروں والے ڈاکٹر ہیں لیکن نسخوں کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے ہیں اور یہی ہماری ان سے دوستی کی وجہ ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب ”اسکیمو ڈاکٹر“ برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کئی ملکوں میں چھپ چکی ہے۔ ہم نے ریڈر ڈائجسٹ میں اس کا ذکر یا خلاصہ پڑھا تھا اور کچھ کچھ یاد تھا۔ یہ سن کر وہ اور خوش ہوا اور اپنی بی بی سے کہا۔ دیکھو یہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے اس نے غیڈغ ڈائجسٹ میں میری کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ فرانسیسیوں کی طرح ”ر“ کا تلفظ وہ ہمیشہ ”غ“ ہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر گلبرگ مہم جو آدمی ہیں۔ برسوں وہ گرین لینڈ جا کر اسکیموؤں کے ساتھ رہے۔ ان کی زبان اور معاشرت اختیار کی۔ انھی کا سب سے نمک کھانا کھاتے رہے۔ یہی مچھلی، ریچھ کا گوشت وغیرہ، برف کے جھونپڑوں میں قیام کیا اور پھر یہ کتاب لکھی۔ اب میاں بی بی ایشیا اور مشرق بعید کے دورے پر نکلے تھے۔ کینیا، ہندوستان، تھائی لینڈ اور نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ اب کابل اور تہران ہو کر وطن واپسی کا پروگرام تھا۔ ہندوستان سے یہ لوگ ایک شب ٹھہر کر

(United Nations Scientific and Cultural Organization) UNESCO ل

Hamlet ج Elsinore Castle ج

بھاگے کیونکہ یہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر ”جن پتہ“ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس روز سادھوؤں اور غیر سادھوؤں کی طرف سے گنوکشی کے معاملے پر خوف ناک مظاہرہ ہوا تھا جس میں جان و مال کا بے حد نقصان ہوا۔ مظاہرین نے مغربی ٹورسٹوں کو بھی جہاں وہ نظر آئے گھیر لیا اور کہا یہ لوگ بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ خشمگین مجمعے کے زرخے سے نکل کر ہوٹل واپس پہنچے اور اسی دن نیپال روانہ ہو گئے۔

پاکستانیوں خصوصاً پشاور والوں کے یہ بہت معترف تھے کہ بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں۔ پی آئی اے کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے کہ اس کے آدمی بہت خلیق اور متواضع ہیں۔ ہاں اپنے پشاور والے ہوٹل کے نام سے بے مزا ہوتے تھے۔ کہتے تھے یہ نظر بٹو ہے تاکہ پاکستان کو نظر نہ لگ جائے۔ دیکھو کابل ہوٹل میں یہ چار ڈالر روزانہ کا کتنا اچھا کمرہ ہے۔ اسے گرم رکھنے کا مرکزی نظام بھی ہے۔ قالین، فرنیچر، سروس سبھی کچھ معقول۔ پشاور میں تین روز رہا اور اس باوا آدم کے زمانے کے کمرے کے تیرہ ڈالر روزانہ دیتا رہا۔ یہی نہیں ان لوگوں نے پانچ روپے روزانہ اس لکڑی کے بھی مجھ سے وصول کیے جو کمرہ گرم رکھنے یا اس میں دھواں پھیلانے کے لیے روزانہ جلانی پڑتی تھی۔

جاتے ہوئے جن لوگوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟ ان کی اطلاع کے لیے گزارش ہے کہ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مطلب چار ٹانگوں والی بلا سینگ کی مخلوق سے ہے۔ دو ٹانگوں والے بھی یقیناً ہوں گے ہم نے زیادہ جستجو نہیں کی۔ یہ گدھے وہ تھے جو زرنگار پارک کے سامنے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان کے پالان سنگتروں سے بھرے تھے۔ یہاں سنگترے ٹل کر جکتے ہیں۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی سنگتروں پر چل گئیں اور بولیں ان کا بھاؤ پوچھو۔ ہم نے بھاؤ پوچھا: ”آغا چندا است؟“

ایران کی طرح یہاں بھی یہ معلوم ہوا کہ فارسی بولنا آسان ہے۔ سمجھنا مشکل۔ آغانے جو جواب دیا۔ وہ ہمارے پلے نہ پڑا۔ حالانکہ ہم نے چہ؟ چہ؟ کر کے ایک دو بار وضاحت بھی چاہی۔ ان غیر ملکیوں کو یہ بتانا غیر ضروری تھا کہ یہ گدھے والا ان الفاظ میں ادائے مطلب سے قاصر ہے جو ہماری سمجھ میں آسکیں۔ لہذا ہم نے کہا چھوڑیے بہت مہنگا دیتا ہے لیکن وہ خاتون تھوڑی دور ایک اور گدھے کے پاس چل گئیں کہ یہاں سے لے لو یہ سستا دے گا۔ ہم نے ایک باٹ کی طرف اشارہ کر کے سنگتروں والے سے کہا کہ آغابس اس قدر دے دو۔ اس نے تو لا تو چار سنگترے پڑے۔ قیمت ہم نے نہ پوچھی کہ افہام و تفہیم میں وقت نہ ہو۔ آخر باہم زبان سمجھنے نہ سمجھنے کا معاملہ ہمارا اور ہمارے افغان بھائیوں کا ہے ڈنمارک والوں کو اس سے کیا مطلب۔ ہم نے دس افغانی کا نوٹ دیا۔ اس نے چار افغانی کاٹ کر باقی ریزگاری ہمیں دے دی۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی نے ہمارا بہت شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ اس دیار غیر میں جہاں ہماری زبان اور انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ نہ ہونے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے موزوں الفاظ میں کسر لٹسی کے بعد کہا کہ خیر انسان، انسان کے کام آتا ہی ہے۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اندام و غیرہ

۱ آغا اس کا کیا بھاء ہے؟ ۲ سب انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔

جس کام سے ہم کابل گئے تھے، اس کا تعلق کتابوں سے تھا۔ ہم نے اپنے ایک افغانی دوست سے کہا کہ ہمیں کسی پبلشر سے ملوایئے۔

بولے ”یہاں کوئی پبلشر ہی نہیں“

”چھوٹا موٹا تو ہوگا؟“

”نہ چھوٹا نہ موٹا“

”پھر کتب فروش کتابیں کہاں سے لیتے ہیں؟“

”کتب فروش؟ کون سے کتب فروش؟“

ہم نے کہا ”بازار میں کتابیں بیچنے والوں سے مطلب ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشنوں پر بھی بک اسٹال ہوتے ہیں۔ کابل قندھار وغیرہ میں ہوں گے ہی، جہاں سے مسافر سفر میں دل بہلانے کے لیے ناول رسالے، جنتریاں وغیرہ خریدتے ہیں۔“

ہمارے دوست نے کسی قدر جھلّا ہٹ سے کہا:

”میاں! ہوش کی دوا کرو، کون سے ریلوے اسٹیشن اور کیسی ریلوے؟ تمہیں معلوم ہے افغانستان میں ریلوے

نام کی کوئی چیز نہیں یہ شیطانی چرخہ تمہی کو مبارک ہو۔“

تب ہمیں افغانستان کے متعلق وہ مضمون یاد آیا جو ہم نے کابل جانے سے پہلے پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ ”ادھر آپ

نے درّہ خیبر کے پار، افغانستان کی نئی سرزمین میں قدم رکھا، ادھر ایک صدی پیچھے پہنچ گئے۔“

پبلشروں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ افغانستان میں اس نام کی کوئی مخلوق نہیں۔ حکومت کے محکمے اور ادارے

سرکاری مطبوعوں میں کتابیں چھاپتے ہیں۔ ان کی بھی مکمل تعداد پورے ملک میں پانچ ہے۔ پرائیویٹ پریس کوئی نہیں

ہے۔ اوّل تو ان حالات میں کوئی شخص کچھ لکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا اگر کوئی مرزا غالب یا فیض احمد فیض پیدا ہو بھی جائے تو

ازراہ قانون اسے حکومت کو عرضی دینی چاہیے کہ بندے کی یہ تالیف لطیف زیور طبع سے آراستہ کی جائے۔ وہ ٹھوک بجا کر

(کسی کام میں جلدی نہیں کی جاتی) دیکھیں گے کہ ہاں کوئی مضائقہ نہیں تو حکم ملے گا کہ اچھا چھاپے دیتے ہیں۔ کاغذ،

کتابت، طباعت کے پیسے لاؤ اور جب چھپ جائے تو جہاں جی چاہے، جیسے جی چاہے بیچو۔

مانگ کا حال یہ ہے کہ کچھ کتابیں شائقین خرید لے جاتے ہیں، کچھ بنیالے جاتا ہے اور اس میں کشمکش،

چلغوزے وغیرہ ڈال کر بیچتا ہے۔ ہمارے انھی دوست نے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کہو۔ اس نظام میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ

بیہودہ شاعری اور رنگیلے ناولوں وغیرہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

ریلوے کی کہانی یہ معلوم ہوئی کہ شاہ امان اللہ خان نے اپنے زمانے میں دارالامان نام کی تازہ بہشتی بسائی تھی

وہاں تک ریلوے لائن..... ریلوے لائن نہ کہیے ٹرائی لائن بچھائی تھی۔ بچہ سقا نے ان کا تاج و تخت چھینا تو پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرنگیوں کی بدعت قرار دے کر اکھاڑ پھینکا۔ ہم نے ”دارالامان“ میں اس کے اکھڑے ہوئے زنگ خوردہ سلپر اور دو تین ٹوٹی پھوٹی بوگیاں آثارِ صنایع کے طور پر ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑی پائیں جو ایک زمانے میں ریلوے اسٹیشن تھا۔

دریائے کابل جو شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے، ہمارے ہوٹل سے کچھ دور نہ تھا۔ دریا لفظ کے استعمال کے لیے ہم دریائے ستلج اور سندھ، دریائے گنگا اور جمنا، دریائے ہوانگ ہو اور تنگسی وغیرہ سے تہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ کراچی والے دریائے کابل کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس گندے نالے کو دیکھ لیں جو نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے لیکن وین کالج کے پاس سے گزرتا ہے۔ فرق اس نالے اور دریائے کابل میں یہ ہے کہ اس نالے کا پانی نسبتاً صاف ہے اور اس میں اتنی زیادہ بو نہیں آتی۔ پانی کی مقدار بھی آج کل تو اسی نالے میں زیادہ ہے۔ ہاں گرمیوں میں سنا ہے برف پگھلتی ہے تو دریائے کابل کی ناطقتی کچھ دور ہو جاتی ہے۔ دیوار پر سے نیچے جھانکیں تو دریا کی غریب نوازی کا نقشہ یہ نظر آتا ہے کہ یہاں ایک بڑھیا کپڑے دھو رہی ہے۔ تھوڑا آگے اس میں بچے نہا بھی رہے ہیں اور آس پاس کے گھر والوں کو بھی کوڑا پھینکنے کا بڑا آرام ہے۔ ٹوکری اٹھائی اور دریا میں جھاڑ دی یہی دریا پیاسوں کی تشنگی بھی رفع کرتا ہے کیونکہ نئے حصہ شہر کو چھوڑ کر پرانے شہر میں گھروں تک پانی کے پائپ لے جانے کا کوئی سلسلہ نہیں۔ ہتھی والے اور کہیں کہیں دوسرے نکلے البتہ ہیں جن سے محلے والے اپنی باری سے مٹی کے مٹکے اور جھجھریں بھر لے جاتے ہیں۔ ان مٹکوں کی وضع قطع کے ظرف ہم نے یا تو عجائب گھروں میں دیکھے یا پھر باعیات عمر خیام کی بعض تصویروں میں صراحی آپ نے دیکھی ہے؟ ان سے ذرا بڑے ہوتے ہیں، لہذا انھیں صراحی کہہ لیجیے۔ ایک طرف کو پکڑنے کے لیے دستہ بھی لگا دیجیے۔ بے شک اب حکومت پانی پائپوں کے ذریعے گھروں تک پہنچانے کا بندوبست کر رہی ہے، لیکن فی الحال تو شہر میں ستوں کا راج ہے۔ ایک سقا تو کچھ دنوں تک ملک کا بادشاہ بھی رہا ہے، لیکن وہ الگ کہانی ہے۔

(دنیا گول ہے)

۱۔ افغانستان کا ایک حکمران جو ماٹلی کا بیٹا تھا اور ڈاکو بن گیا تھا اور جس نے شاہ امان اللہ خان سے حکومت چھین لی تھی۔

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

- الف۔ مصنف ابتدا میں کابل کے بجائے پشاور کے ہوائی اڈے پر کیوں اترے؟
- ب۔ مصنف نے پشاور کے عرصہ قیام کے دوران میں کس ہوٹل میں قیام کیا اور یہ ہوٹل ان کو کیسا لگا؟
- ج۔ مصنف پشاور کی سیر سے کیوں خائف ہو گئے؟
- د۔ ڈاکٹر گلبرگ نے اپنی کتاب ”اسکی موڈ اکثر“ لکھنے کے لیے کیا کیا جتن کیے؟
- ہ۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی کو بلوچستان میں اپنا عرصہ قیام کیوں مختصر کرنا پڑا؟
- و۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی نے کابل میں سگترے کیسے خریدے؟
- ز۔ مصنف نے کابل جانے سے پہلے افغانستان کے بارے میں کیا پڑھا تھا؟
- ح۔ افغانستان میں پبلشرز یا بک سیلز کیوں نہیں ہوتے؟
- ط۔ افغانستان میں ریلوے لائن کیوں نہیں ہے؟

۲۔ مصنف نے دریائے کابل کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:

توران، تعویق، کلد، کماحقہ، کس نفسی، بدعت، آثار صنادید، خشمگیں

۴۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

کچا پڑنا، نظر لگنا، چل جانا، پلے پڑنا، سرمنڈھنا، جان چھوٹنا، بے مزہ ہونا

۵۔ سبق کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالی جگہوں کو پُر کیجیے:

الف۔ ان لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر----- پر اتر آئے تھے۔

(مار کٹائی، تو تکار، طعنے تشنے)

(جل، دہک، سلگ)

ب۔ آتش دان میں آتش----- رہی ہے۔

ج۔ ان کی وضع قطع ----- سب سے الگ تھی۔

(حج دھج، شکل صورت، تراش خراش)

د۔ ”افغانستان میں ریلوے نام کی کوئی چیز نہیں، یہ ----- تمھی کو مبارک ہو۔“

(بدعت، ایجاد، شیطانی چرخہ)

ہ۔ پورے ملک میں مطبوعوں کی تعداد ----- ہے۔

(پانچ، پچاس، اُن گنت)

و۔ شاہ امان اللہ خاں نے اپنے زمانے میں ----- نام کی تازہ ہستی بسائی تھی۔

(دارالعوام، دارالامان، دارالاسلام)

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں کو مطابقت کے اصولوں کے پیش نظر درست کر کے لکھیے:

الف۔ ”مکاتیب غالب“ ٹھپ گئے ہیں۔

ب۔ جلے میں عورتیں بھی آئیں ہوئیں تھیں۔

ج۔ میاں بیوی ہنسی خوشی رہتی ہے۔

د۔ گھر عورت کی سلطنت ہوتی ہے۔

ہ۔ نیکی کا راہ بہت کٹھن ہے۔

☆☆☆☆☆